۱۵

اگر چالیس مؤمن بھی متوکل اور وفادار ہوں تو وہ ساری دنیا فتح کر سکتے ہیں

(فرمودہ یکم مئی ۱۹۳۶ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

انسانی اخلاق میں بعض باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو قلوب پر اثر کرنے کے لحاظ سے دوسرے اخلاق سے زیادہ مؤثر اور زیادہ حرکت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ گو عام حالات میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ ہر شخص بعض خاص قسم کی باتوں سے متاثر ہوتا ہے، کئی آدمی سچائی کی بات سن کر زیادہ متاثر ہوتے ہیں، کئی آدمی دیانت کا واقعہ سن کر زیادہ اثر قبول کرتے ہیں، کئی ایسے ہوتے ہیں کہ جو انصاف کی واردات سنتے ہیں تو قلب میں زیادہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، پھر کئی ایسے ہوتے ہیں کہ بہادری کے واقعہ میں زیادہ متاثر ہوتے ہیں، کچھ وفاداری کے واقعات سے زیادہ اثر قبول کرتے ہیں، کچھ لوگ وسعت حوصلہ اور کچھ نرمی سے متاثر ہوتے ہیں۔ غرضیکہ انسانی طبائع مختلف ہیں اور وہ اپنے اپنے رجحان اور اپنے اپنے ادراک کے مطابق واقعات سے اثر قبول کرتی ہیں۔

زلزلہ کے ایام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کچھ دنوں کیلئے باغ میں رہائش اختیار کر لی تھی چونکہ الہاموں سے اَور زلزلوں کا پتہ چلتا تھا اس لئے آپ کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو وہ قریب میں آنے والے ہوں۔ ان ایام کی بات ہے کہ ایک جگہ پر مختلف جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ جن میں

مختلف دوست رہتے تھے۔ایک جھونپڑی میں حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم رہتے تھے اور ان کے ساتھ والی جھونپڑی میں ایک اور دوست رہتے تھے۔مولوی صاحب کی طبیعت میں سخت تیزی تھی اوراس دوست کی طبیعت میں بہت نرمی تھی وہ شہر میں بھی مولوی صاحب کے پڑوس میں ہی رہا کرتے تھے مگر وہاں جھونپڑیاں بہت ہی پاس پاس ہوگئیں۔اس دوست کے بچوں کو رونے کی بہت عادت تھی ادھر مولوی صاحب کی طبیعت بہت نازک تھی وہاں بہت زیادہ قریب رہنے کی وجہ سے بچوں کا شور سنتے سنتے مولوی صاحب سخت تنگ آ گئے۔ایک دن آپ نے اس دوست کو بلایا اور کہا کہ مجھے آپ پر سخت تعجب آتا ہے اور میں حیران ہوں کہ آپ کس طرح کے آدمی ہیں میں نے گھر پر بھی دیکھا ہے کہ آپ کے ہاں سے شور اور اودھم مچانے کی آوازیں برابر آتی رہتی ہیں مگر وہاں تو کچھ فاصلہ تھا اور اب تو جھونپڑیاں زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے میں بالکل برداشت نہیں کرسکتا اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں باہر آ کر ان بچوں کو خوب ماروں اور آپ پر مجھے سخت تعجب ہے کہ آپ پاس رہتے ہیں اور ان کو کچھ نہیں کہتے۔یہ سن کر اس دوست نے کہا کہ مولوی صاحب مجھے بھی آپ پر سخت تعجب ہے کہ وہ میرے پاس شور کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ نادان ہیں بچوں کا کام ہی شور کرنا ہوتا ہے باوجود اس قدر قریب ہونے کے مجھے کوئی غصہ اور جوش نہیں آتا اور میں حیران ہوں کہ آپ کو اس قدر دور بیٹھے ہوئے کیوں اس قدر جوش آتا ہے۔گویا مختلف طبائع نے ایک ہی واقعہ سے الگ الگ اثر قبول کیا۔ایک نے یہ اثر قبول کیا کہ ان بچوں کو سزا دینی چاہئے اور ایک نے یہ کہ بچوں کا یہی کام ہے یہ نادان ہیں اور ان کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنی چاہئے یہ اثر اتنا نمایاں تھا کہ ہر ایک کو دوسرے پر تعجب آتا تھا۔مولوی صاحب اس بات پر حیران تھے کہ وہ دوست اس قدر شور کو کیسے برداشت کرسکتے ہیں اور وہ ان پر حیران تھے کہ ان کو یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ بچوں کو سزا دینی چاہئے۔پس لوگ عام طور پر خاص خاص جذبات سے خاص خاص اثر قبول کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایک ہی واقعہ سے مختلف اثر قبول کرتے ہیں اور یہ تفاوت مختلف حالات میں گھٹتا اور بڑھتا جاتا ہے۔مگر باوجود اس کے اس میں شبہ نہیں کہ بعض اخلاق دنیا پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور لوگوں کو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں اور ایسے اخلاق میں سے بہادری اور وفاداری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔دنیا کا اکثر حصہ ان دو اخلاق سے نہایت ہی متأثر ہوتا ہے

اور انسان جب اس قسم کے واقعات سنتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کے قلب میں بھی ویسے ہی خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اسی طرح کی بہادری اور جرأت دکھاؤں۔ یہ دونوں اخلاق اس قسم کے ہیں کہ دوسروں سے زیادہ اثر پیدا کرتے ہیں اس میں بھی خاص وجہ ہے مگر میں اس وقت یہ بحث کرنے کیلئے کھڑا نہیں ہوا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اخلاق ضرور زیادہ اثر ڈالتے ہیں اور طبائع جب ایسے واقعات دیکھیں تو ضرور متاثر ہوتی ہیں خواہ وہ دشمن سے ہی کیوں نہ سرزد ہوں۔ ایک دشمن بھی اگر بہادری دکھاتا ہے تو دوسرا دشمن اس سے ضرور متاثر ہوتا ہے ایک دشمن بھی اگر وفاداری کا نمونہ پیش کرتا ہے تو دوسرا اُس سے ضرور اثر پذیر ہوتا ہے اور اگر دوست بھی بزدلی دکھاتا ہے یا کسی غیر سے بھی بے وفائی کا اظہار کرتا ہے تو باوجود دوست ہونے کے اس کا یہ فعل دوسرے دوست کے دل پر گراں گزرتا ہے۔ پس یہ دو اخلاق جو نہایت گہرے طور پر انسانی فطرت پر مؤثر ہوتے ہیں ان کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ ایمان سے ان کا بہت گہرا تعلق ہے۔ کوئی شخص بغیر بہادری کے متوکل نہیں ہوسکتا اور کوئی بغیر وفاداری کے کامل الایمان نہیں ہوسکتا۔ متوکل کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھتا اور دنیا کی کسی چیز کو حقیقی قرار نہیں دیتا اور بزدلی کے یہ معنی ہیں کہ وہ کسی چیز کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں۔ پس توکّل اور بہادری اور ایمان وفاداری قریباً مترادف الفاظ ہیں بیوفا شخص ایماندار نہیں ہوسکتا اور بزدل متوکل نہیں ہوسکتا۔ کوئی شخص جتنا جتنا زیادہ توکل میں کمال حاصل کرتا چلا جائے اتنا ہی زیادہ بہادر ہوتا جائے گا اور جتنا کسی کے اندر ایمان بڑھتا جائے وہ اتنا ہی وفادار ہوتا جائے گا۔ درحقیقت توکل نام ہے مذہبی بہادری کا اور ایمان نام ہے مذہبی وفاداری کا۔ جب مذہب اور وفاداری جمع ہو جائیں تو اسے ایمان کہتے ہیں اور جب مذہب اور بہادری جمع ہو جائیں تو اسے توکّل کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں یہ دونوں باتیں نہایت نمایاں ہیں اور ان سے پہلے انبیاء کی زندگیوں میں بھی جن کی تاریخ کسی حد تک محفوظ ہے یہ دونوں باتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایمان کے ساتھ ساتھ وفاداری اور بہادری بھی ترقی کرتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ وفاداری اور بہادری کے ایسے اعلیٰ معیار پر پہنچ چکے تھے کہ اس سے اوپر کوئی معیار نظر نہیں آتا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس

سے اوپر کوئی معیار ہے نہیں لیکن ہماری کمزور نظر اس سے اوپر دیکھ نہیں سکتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بچے تھے اور یتیم بچے ان کا چچا ان کو پال رہا تھا ان کو جس وقت ساری قوم نے شرک کیلئے مجبور کیا جسے ان کی فطرت قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھی ان کے چچا اور چچازاد بھائیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم پروہت ۱؎ ہیں اور ہمارا گزارا ہی اس پر ہے اگر آپ نے بتوں کی پرستش نہ کی تو ہمارا رزق بند ہو جائے گا۔ اُس وقت اس نہایت ہی چھوٹی عمر کے بچے نے دلیری سے یہ جواب دیا کہ جن بتوں کو انسان اپنے ہاتھ سے گھڑتا ہے ان کو میں ہرگز سجدہ نہیں کرسکتا۔ اس جواب کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا صرف وہی کرسکتا ہے جسے قربانی کرنے کا موقع ملا ہو۔

آج جبکہ ایک منظّم حکومت ہندوستان میں موجود ہے اور میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ظلم ہوتا نہیں کیونکہ ہمیں خود ظلم کا نشانہ بنایا جارہا ہے لیکن اکثر حکام انصاف کی کوشش ضرور کرتے ہیں ایک قانون موجود ہے جو چاہتا ہے کہ انصاف ہو گو ظالم اپنے ظلم کیلئے اس میں سے رستے نکال لیتے ہیں لیکن پھر بھی ظلم حد کے اندر رہتا ہے اس پُر امن زمانہ میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں پر جب صداقت کھل جاتی ہے تو وہ مجھے لکھتے ہیں کہ اگر ہم مسلمان یا احمدی ہو جائیں تو ہمارے گزارہ کی کیا صورت ہوگی؟ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی؟ آج جب احمدیت کو قبول کرنے میں کوئی خاص تکالیف نہیں سوائے معمولی تکالیف کے اچھے اچھے تعلیم یافتہ، بڑی عمر کے اور بیوی بچوں والے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی؟ گزارہ کا کیا انتظام ہوگا؟ لیکن حضرت ابراہیم جو یتیم ہونے کی وجہ سے پہلے پہلے ہی شکستہ دل تھے اور جن کا پہلے ہی کوئی ٹھکانہ نہ تھا اپنے چچا کے ہاں اور اس کی مہربانی سے پرورش پارہے تھے وہ اپنے دل سے یہ سوال نہیں کرتے کہ اب گزارہ کی کیا صورت ہوگی بلکہ بِلا سوچے بہادرانہ طور پر یہ جواب دیتے ہیں کہ جن بتوں کو انسان خود گھڑتے ہیں اُن کو میں سجدہ نہیں کرسکتا۔

بعینہٖ اسی قسم کا واقعہ رسول کریم ﷺ کو پیش آیا جب ایک لمبے عرصہ تک آپ نے شرک کے خلاف تعلیم دی اور ایک لمبی کوشش کے بعد اہلِ مکہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو دوبارہ اپنے دین میں شامل کرلینے سے مایوس ہوگئے تو مکہ کے رؤساء آپ کے چچا ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ

آپ کی خاطر ہم اب تک آپ کے بھتیجے سے نرمی کرتے رہے ہیں مگر ہمارے سایہ کے نیچے رہتے ہوئے اس نوجوان نے ہمارے معبودوں کو بہت بُری طرح ذلیل کیا ہے ہم اس پر سختی کر سکتے تھے مگر ہمیں آپ کا لحاظ تھا اس لئے اس سے وہ سلوک نہ کیا جس کا وہ مستحق تھا مگر اب یہ بات ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہے اور ہم یہ آخری پیغام لے کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اسے سمجھائیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اپنی تعلیم پیش نہ کرے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں پر سختی سے حملہ نہ کرے اور تبلیغ میں نرمی کا پہلو رکھے اور اگر وہ آپ کے کہنے سے اتنا بھی کرنے کیلئے تیار نہ ہو تو آپ اس سے قطع تعلق کرلیں اور ہم پر اس کا معاملہ چھوڑ دیں اگر آپ اس کیلئے تیار نہیں ہیں تو گو ہمارے دلوں میں آپ کا ادب بہت ہے اور آپ کے خاندان کو فضیلت حاصل ہے لیکن اب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ہم صبر نہیں کر سکتے اور آپ سے بھی ہمیں مجبوراً قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ ابوطالب مؤمن نہ تھے اور ایمان کے بعد جس بہادری سے انسان کا تعلق ہو جاتا ہے اس سے محروم تھے وہ رئیس تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ریاست سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ تھا۔ سارا مکہ اُن کو سلام کرتا تھا اور اب ان کے سامنے جو صورتِ حالات تھی اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی اُن کو منہ بھی نہ لگاتا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس قسم کی عزتوں کیلئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں بھی کر دیتے ہیں اور ایک ایک سلام کیلئے مرا کرتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل سنایا کرتے تھے کہ جب آپ تعلیم سے فارغ ہوکر نئے نئے بھیرہ میں آئے تو بعض مولویوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ وہابی ہیں اور بعض نے آپ کے خلاف کفر کے فتوے کی تحریک شروع کی۔ اُس وقت اس علاقہ میں ایک معزز پیر صاحب تھے جن کا بھیرہ اور نواح میں بہت اثر تھا اور فتویٰ کفر شائع کرانے والے ان کے پاس بھی گئے کہ دستخط کر دیں۔ باقی مولویوں سے تو حضرت خلیفہ اوّل کے دوست نہ ڈرتے تھے مگر ان پیر صاحب کے متعلق انہیں ضرور خیال تھا کہ اگر یہ بھی مولویوں کے ساتھ مل گئے تو فساد بڑھ جائے گا اس لئے آپ کے دوستوں میں سے ایک زیرک دوست پیر صاحب کے پاس پہنچے اور کہا کہ سنا ہے مولوی لوگ آپ سے فتویٰ لینے آئے تھے۔ پیر صاحب نے کہا ہاں آئے تھے اور جو باتیں وہ کہتے ہیں ٹھیک ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ فتویٰ دے دوں۔ اس پر اس دوست نے کہا کہ آپ تو پیر ہیں اور سب نے آپ کو سلام کرنا ہے نوردین خواہ

کچھ ہو آپ کو سلام تو ضرور کرتا ہے اور اگر آپ نے فتویٰ دے دیا تو وہ اور ان کے دوست آئندہ آپ کو سلام نہیں کریں گے۔ اس پر پیر صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ بھلا ہم پیروں کا فتووں سے کیا تعلق ہے آپ مولوی صاحب سے کہہ دیں کہ سلام نہ چھوڑیں۔ اس دوست نے آکر حضرت خلیفہ اوّل سے کہا کہ میں اس طرح کر آیا ہوں اور اب پیر صاحب چاہیں گے کہ آپ اُن کو سلام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا کیا حرج ہے کر دیں گے۔ چنانچہ وہ دوست پھر پیر صاحب کے پاس گئے اور پیر صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ پیر صاحب بڑے آدمی ہیں ہم ان کو سلام کیوں نہ کریں گے۔ اس پر پیر صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اچھا ہم فلاں روز اس طرف سے گزریں گے مولوی صاحب سے کہنا کہ ضرور سلام کریں۔ چنانچہ پیر صاحب حضرت مولوی صاحب کے مطب کے سامنے سے گزرے اور حضرت مولوی صاحب نے اپنے دوستوں سمیت باہر نکل کر اُن کو سلام کیا۔ پیر صاحب نے گھوڑا کھڑا کر لیا اور حضرت مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگے کہ دیکھو! ہمارے پاس مولوی لوگ فتوے کیلئے آئے تھے مگر ہم نے انکار کر دیا کہ ہم کو ان باتوں سے کیا تعلق ہے ہمیں سب نے سلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ شہر میں پھیل گیا اور پیر صاحب کے مرید اس تحریک سے الگ ہو گئے اور مخالفت کا زور ٹوٹ گیا۔ غرض ابو طالب کیلئے یہ بڑا امتحان تھا وہ سارے شہر میں مکرم سمجھے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اُن کی عزت جاتی رہے گی انہوں نے رسول کریم ﷺ کو بلوایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! میں سمجھتا ہوں کہ تُو جو کرتا ہے سچ سمجھ کر کرتا ہے اور میں نے بھی ہمیشہ تیری مدد کی ہے اور تجھے دشمنوں سے بچایا ہے مگر اب میری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں اور کہا ہے کہ یا تو اپنے بھتیجے سے کہو کہ تبلیغ میں نرمی کرے اور یا پھر اس سے قطع تعلق کر لو اور اگر میں ایسا نہ کروں تو قوم میرے ساتھ قطع تعلق کر لے گی اور تُو جانتا ہے کہ قوم کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے اب تُو بتا تیری کیا رائے ہے؟ رسول کریم ﷺ نے جس وقت یہ بات سنی آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا اے میرے چچا! میرے دل میں آپ کا بڑا ادب ہے مگر سچائی کے مقابلہ میں مَیں آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوں اگر دشمن میری دائیں طرف سورج اور بائیں طرف چاند لا کر کھڑا کر دیں تو بھی میں تبلیغ میں نرمی نہیں کروں گا اور توحید کی اشاعت سے باز نہیں رہوں گا[۲]۔ میں آپ کیلئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ بات

آپ کی نہیں مان سکتا آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے صلح کر لیں میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اس پر باوجود اِس کے کہ ابوطالب کیلئے قوم کا چھوڑنا مشکل تھا اِس دلیرانہ جواب کو سُن کر ان پر یہ اثر ہؤا کہ انہوں نے کہا کہ اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو بے شک چھوڑ دے میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔

ابوطالب کے اس جواب کی اہمیت کا پورا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو تاریخ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک اور واقعہ کو نہیں جانتے جس سے ابوطالب کی قلبی کیفیت کا پتہ چلتا اور یہ معلوم ہوتا کہ انہیں اپنی قوم سے کتنی محبت تھی۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو چونکہ رسول کریم ﷺ کو اُن سے بہت ہی محبت تھی اُن کی قربانیوں اور حُسنِ سلوک کی وجہ سے، اس لئے آپ کو سخت دُکھ تھا کہ آپ مسلمان ہوئے بغیر مر رہے ہیں۔ آپ کبھی ان کے دائیں جاتے اور کبھی بائیں اور کہتے کہ اے چچا! اب موت کا وقت قریب ہے **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ** کہہ دیجئے مگر ابوطالب خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر رسول کریم ﷺ نے بہت اصرار کیا آپ پر رقت طاری تھی اور آپ بار بار کہتے تھے کہ اے چچا! ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیں تا کہ میں خدا کے حضور کہہ سکو کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ابوطالب نے آخر میں یہی جواب دیا کہ میں اپنی قوم کے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ گویا ان کو اپنی قوم سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس کے بغیر جنت میں بھی جانا نہ چاہتے تھے۔ اسی قوم سے اس قدر شدید محبت رکھنے والے شخص پر رسول کریم ﷺ کے بہادرانہ جواب کا یہ اثر ہؤا کہ اُس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو چھوڑ دے میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا[۳]۔

غرض ایسے واقعات کو دیکھ کر دوست تو کیا دشمن بھی متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہر شخص خواہ اس کے دل میں کتنا عِناد بھی کیوں نہ ہو ان واقعات کو سن کر سر جھکا لیتا ہے اور ایسے بہادر کی عظمت کے اقرار پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی زندگی میں ایسے بیسیوں نہیں سینکڑوں واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بہادری کے ایسے بلند مقام پر تھے کہ اس سے اوپر خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بہادری کہاں سے پیدا ہوئی؟ یہ توکّل ہی سے تھی۔ دنیا دار جسے بہادری کہتے ہیں مذہبی لوگ اسے توکّل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہی ہے کہ

بہادری کے لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا یہ چیز کہاں سے آئی اور توکّل کا لفظ بتا دیتا ہے کہ اس قسم کی بہادری اعلیٰ مقصد سے پیدا ہوتی ہے۔ توکّل کے یہی معنی ہیں کہ خدا کے مقابلہ میں انسان ہر چیز کی قربانی کیلئے تیار ہو گویا توکّل کا لفظ بہادری کے اسباب و وجوہ اور اس کا منبع بھی بتا دیتا ہے اور بہادری و توکّل میں صرف یہی فرق ہے ورنہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں۔ اسی بہادری کو ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں بھی دیکھتے ہیں اور صحابہ میں ہی نہیں بلکہ صحابیات میں بھی ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے اور نہ صرف عورتوں بلکہ بچوں میں بھی موجود ہے۔ آج وہ زمانہ آیا ہے کہ لوگ اسلام اور ایمان کیلئے قربانی سے بچنے کیلئے عذر اور بہانے تلاش کرتے ہیں اور وقت آنے پر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ دقّت ہے وہ روک ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کے ماتحت مسلمانوں میں قربانی کا وہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ مرد اور بالغ عورتیں تو الگ رہیں بچے بھی اسی جذبہ سے سرشار نظر آتے تھے یہاں تک کہ بدر کی جنگ کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بلایا تا کہ ان میں سے ان لوگوں کا انتخاب کریں جو جنگ کے قابل ہوں۔ اُس وقت ایک لڑکے کے متعلق آتا ہے دوسرے صحابہ اور وہ خود بھی بیان کرتا ہے کہ جس وقت وہ لوگ کھڑے ہوئے وہ بھی اس جوش میں کہ اسلام کی خاطر جان قربان کرنے کا موقع ملے اُن میں کھڑا ہو گیا مگر چونکہ قد چھوٹا تھا دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں چھوٹا معلوم ہوتا تھا اس وجہ سے خطرہ تھا کہ شاید منتخب نہ ہو سکے اس لئے وہ اپنی انگلیوں کے بل کھڑا ہو گیا اور ایڑیاں اوپر اُٹھا لیں تا قد اونچا معلوم ہو اور چھاتی تان لی تا کمزور نہ سمجھا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ پندرہ سال سے کم عمر کا کوئی لڑکا نہ لیا جائے اور جب آپ انتخاب کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تو فرمایا کہ یہ بچہ ہے اسے کس نے کھڑا کر دیا ہے اسے ہٹا دو۔ مگر آج ایسا ہوتا تو شاید ایسا بچہ خوشی سے اُچھلنے لگتا کہ میں بچ گیا لیکن جب اُس بچہ کو الگ کیا گیا تو وہ اتنا رویا اتنا رویا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آ گیا اور آپ نے فرمایا اچھا اسے لے لیا جائے[۴]۔

پھر اُس زمانہ کی عورتوں کا یہ حال تھا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور کہا کہ **یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!** قرآن کریم کس کیلئے ہے؟ آپ نے فرمایا سب انسانوں کیلئے۔ اس نے عرض کیا کیا عورتوں کیلئے بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر جہاد کے حکم پر عورتوں کو کیوں عمل

کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ مرد جا کر جانیں قربان کرتے ہیں اور عورتیں اس ثواب سے محروم رہتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے مردوں کو لے جانے کا ہی حکم ہے مگر اُس عورت نے بہت اصرار کیا کہ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کروں گی آپ نے فرمایا کہ اسے لے لیا جائے [۵] اور حکم دیا کہ جب بھی مالِ غنیمت آئے اس عورت کو بھی مردوں کے مساوی حصہ دیا جایا کرے کیونکہ اس نے انکار کیا کہ یہ اس وقت گھر میں بیٹھی رہے جبکہ مرد اپنی جانیں قربان کر رہے ہوں۔ غرضیکہ مرد کیا اور عورت کیا سب نے اپنی قربانی سے یہ بات دکھا دی کہ ایمان نے ان کے اندر ایسی جرأت پیدا کر دی تھی کہ جس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی۔ یہ چیز گو ایمان سے بہت شاندار ہو جاتی ہے مگر غیر مؤمنوں میں بھی اس کا فقدان نہیں ہوتا۔ ایمان اگرچہ اسے صیقل کر دیتا ہے مگر غیر دیندار اقوام میں بھی یہ پائی ضرور جاتی ہے۔

گزشتہ ایام میں ترک دین سے بالکل بے بہرہ ہو چکے تھے گو کہلاتے مسلمان تھے اور اب تو دین سے بہت ہی دور چلے گئے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے شریف قوم شریف جذبات سے عاری نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں ہم قریباً مہینہ بھر یہ خبر پڑھتے رہے کہ ایک جانباز تُرک سپاہی ایک پہاڑی پر کھڑا ہو کر دشمن کو سخت نقصان پہنچاتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے پکڑا نہیں جاتا۔ آخر ایک دن وہ پکڑا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک تُرک عورت تھی اور پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ مرد جب لڑنے کیلئے آئے تو میں نے یہ درست نہ سمجھا کہ میں گھر میں بیٹھی رہوں چنانچہ میں اکیلی ہی چلی آئی اور اس پہاڑی پر بیٹھ کر جب بھی مجھے موقع ملتا قوم کا بدلہ لیتی رہی۔ تو یہ بہادری کے جذبات دین سے باہر بھی ملتے ہیں اور بعض اوقات وہ بھی بہت شاندار ہوتے ہیں گو اتنے نہیں جتنے ایمان اور توکل کے ساتھ۔

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ سنایا ہے کہ جب یونان سے ترکوں کی جنگ ہوئی تو یورپین قومیں منصوبہ بازیاں کرتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یونانی دروں کے قلعے فتح کرنے آسان نہیں اور جب تک تُرک اُن تک پہنچیں گے وہ اپنے اندر اتحاد پیدا کر کے بیچ میں آ کُودیں گی اور پھر ترکوں کو ذلّت کی صلح پر مجبور کر دیں گی۔ تُرک بھی اس بات سے ناواقف نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے جرنیلوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو دروں کے قلعے فتح کر لئے جائیں۔ ایک پہاڑی

قلعہ کو فتح کرنے پر ایک ترک جرنیل مامور تھا اور اسے حکم تھا کہ دو یا تین ہفتہ کے اندر اندر اسے فتح کرے۔ اُس نے متواتر حملے کئے مگر ناکام رہا آخر ایک دن اُس نے سپاہیوں کو بُلا کر کہا کہ یہ معمولی لڑائی کا سوال نہیں بلکہ ہماری قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے اس لئے ہمیں اس بات سے بے پرواہ ہو کر کہ ہم میں سے کون جیتا رہتا اور کون مرتا ہے کل حملہ کرنا چاہئے اور اس نیت سے کرنا چاہئے کہ یا تو سب کے سب مرجائیں گے اور یا کل شام تک قلعہ میں ہوں گے۔ سب نے اِس کا اقرار کیا اور اگلے روز وہ سپاہیوں کو لے کر قلعہ کی طرف بڑھا۔ وہ دیوانہ وار اوپر چڑھتے جا رہے تھے جب نصف فاصلہ طے کر چکے تو اس کرنیل کے گولی لگی اور وہیں گر گیا اس کے ساتھی اسے اُٹھانے کیلئے آگے بڑھے مگر اس نے کہا تم کو خدا کی قسم ہے مجھے کوئی مت چھوئے اگر تم قلعہ کو فتح کر سکو تو اس کے اندر مجھے دفن کر دینا ورنہ میری لاش کو کُتّوں کے آگے ڈال دینا۔ یہ بات سن کر سپاہی جو اس کی شفقت اور محبت کی وجہ سے اس کے گرویدہ تھے دیوانہ وار آگے بڑھے اور شام سے پہلے پہلے قلعہ کو فتح کر لیا۔ تو یہ جذبات ہر قوم میں اور ہر حالت میں پائے جاتے ہیں حتّٰی کہ بُزدل قوموں میں بھی انفرادی طور پر اس کی مثالیں مل جاتی ہیں اور تباہ شدہ قوموں میں بھی ملتی ہیں۔

جب جنگ بلقان ہوئی تو میں اس کے تفصیلی حالات سے واقف رہنے کیلئے بعض انگریزی اخبار پڑھا کرتا تھا۔ یونان کے ساتھ مختلف قومیں مل کر تُرکوں پر حملہ آور تھیں جب سالونیکا پر حملہ ہؤا تو ترکوں کے بعض غدار افسروں کی وجہ سے ترکوں کو شکست ہوئی۔ اس کے متعلق میں نے لندن کے ایک اخبار میں پڑھا۔ نامہ نگار نے ایک لیفٹیننٹ کا نقشہ کھینچا تھا جب غدار افسروں نے فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا تو اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ ہمیں ہرگز پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ اس پر اعلیٰ افسر نے اسے جھڑک کر کہا کہ تم بیوقوف ہو اور افسروں کی حکم عدولی کرتے ہو اور فوج کو واپس ہونے کا حکم دے دیا۔ نامہ نگار نے لکھا ہے کہ اُس پر میں نے وہ نظارہ دیکھا کہ گو میں غیر جانبدار تھا میری آنکھیں پرنم ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ جب سپاہی پیچھے ہٹنے لگے تو اُس لیفٹیننٹ نے تلوار پھینک دی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر چیخیں مار کر رونے لگا اور اس کے کندھے شدتِ گریہ سے یوں حرکت کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینہ میں انگیٹھی جل رہی ہے۔ تو بہادری کے جذبات ہمیشہ دشمن سے بھی بڑائی کا اقرار کرالیا کرتے ہیں اور ایمان کے ساتھ تو بہادری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ

انسان حیران ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے دنیا میں بُزدلی کیسے رہ سکتی ہے۔ پس مؤمن کو اپنا ایمان پرکھنے کے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ کس حد تک اس کے دل میں جذبۂ جرأت و بہادری ہے اور کس حد تک جذبۂ وفاداری ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کھانے پینے کا بڑا شوق ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو سوال کرتے ہیں کہ کیا کھلاؤ گے، کیا پلاؤ گے اور جب کھانے لگتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کیلئے ہی وہ پیدا ہوئے تھے لیکن یہی لوگ جب ان کے گھروں میں کوئی موت ہو جاتی ہے جب ان کا کوئی عزیز ان سے رخصت ہو جاتا ہے کھانے پینے کی لذت اور خواہش کئی دنوں تک ان کے دل سے جاتی رہتی ہے۔ جب لُقمہ منہ میں ڈالتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ حلق میں پھنستا ہے کوئی چیز خواہ کتنی شیریں کیوں نہ ہو تلخ معلوم ہوتی ہے باوجود اس کے کہ لذیذ کھانا منہ میں اور شیریں پانی پیٹ میں جاتا ہے پیٹ اور منہ اسے ردّ کرتے ہیں اور لذت کی بجائے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایسے ایام میں جبکہ اس سے بہت زیادہ مصیبتیں اسلام کیلئے موجود ہوتی ہیں، جب دین پر بڑی بڑی آفتیں نازل ہو چکی ہوتی ہیں ایسی مصیبتیں اور آفتیں کہ ان کے مقابلہ میں گھروں کی مصیبتیں بالکل ہیچ ہوتی ہیں ہمارے حالات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ ہمارے منہ بدستور کھانوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں اور پیٹ اسی طرح ٹھنڈے پانی کی اشتہاء محسوس کرتے ہیں اور دن میں کسی وقت بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ اسلام کیلئے اس قدر مصائب کے ہوتے ہوئے ہم اس آرام اور سکھ کے مستحق نہیں ہیں اور جب دن میں کسی وقت ہم پر یہ حالت طاری نہیں ہوتی تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے قلوب اس محبت سے آشنا ہیں جو حقیقی محبت کہلاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ میں نے کئی بار سنایا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کئی سال بعد جب ایران سے چکیاں آئیں اور عمدہ آٹا ملنے لگا تو سب سے پہلے جو آٹا تیار ہؤا وہ تحفۃً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جب اس کا پھلکا تیار ہو کر آپ کے سامنے آیا تو آپ نے جب ایک لقمہ لے کر منہ میں رکھا تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ ایک سہیلی پاس بیٹھی تھی اُس نے کہا کہ بی بی! یہ تو بڑا نرم پھلکا ہے آپ اسے کھاتے ہوئے روتی کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اس کی نرمی ہی میرے لئے رونے کا

باعث ہے۔ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں چکیاں نہ تھیں پتھروں پر کوٹ کوٹ کر ہم آٹا بناتے تھے اور رسول کریم ﷺ کو وہی آٹا کھانے کو ملتا تھا۔ بڑھاپے کی عمر میں اور اضمحلال کے وقت بھی آپ یہی کھاتے تھے اور اس پھلکے کی نرمی کو محسوس کر کے میرے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش! رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ایسا آٹا ہوتا تو میں اس کی روٹیاں پکا کر آپ کو کھلاتی [6]۔

ذرا غور کرو نرم آٹا کون سی چیز ہے جسے آج قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ آج تو کنگال بھی اس کی قدر نہیں کرتے اور ان کو بھی آج اس سے بہت بہتر آٹا ملتا ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ملا تھا۔ آج تو رولر ملوں کے آٹے غریب سے غریب لوگ کھاتے ہیں اور انہیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی نعمت ہے۔ اب نعمتوں نے اس آٹے سے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے مگر کیا کبھی کسی کے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ اسلام کے مصائب کی موجودگی میں ان کا استعمال مناسب نہیں۔ ہم کہتے ہیں ہم اسلام کے سپاہی ہیں، محمد ﷺ کے فدائی ہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہم خدا کے نام پر جانیں قربان کرنے والے ہیں مگر کیا ہمارے گلوں میں وہ نعمتیں کبھی پھنستی ہیں؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا اور اس کے دین کی ہتک دنیا میں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کی توہین کرنے والے موجود ہیں مگر کیا دین کی اس انتہائی بے بسی کے باعث ہمارے گلوں میں بھی وہ نعمتیں پھنستی ہیں؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کھانے کا ڈھنگ بالکل نرالا تھا میں نے کسی اور کو اس طرح کھاتے نہیں دیکھا آپ پھلکے سے پہلے ایک ٹکڑا علیحدہ کر لیتے اور پھر لقمہ بنانے سے پہلے آپ اُنگلیوں سے اُس کے ریزے بناتے جاتے اور منہ سے **سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ** کہتے جاتے اور پھر ان میں سے ایک چھوٹا سا ریزہ لے کر سالن سے چھو کر منہ میں ڈالتے۔ یہ آپ کی عادت ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ دیکھنے والے تعجب کرتے اور بعض لوگ تو خیال کرتے تھے کہ شاید آپ روٹی میں سے حلال ذرّے تلاش کر رہے ہیں لیکن دراصل اس کی وجہ یہی جذبہ ہوتا تھا کہ ہم کھانا کھا رہے ہیں اور خدا کا دین مصائب سے تڑپ رہا ہے۔ ہر لقمہ آپ کے گلے میں پھنستا تھا اور **سُبْحَانَ اللّٰہ سُبْحَانَ اللّٰہ** کہہ کر آپ گویا اللہ تعالیٰ کے حضور معذرت کرتے تھے کہ تو نے یہ چیز ہمارے ساتھ لگا دی ہے ورنہ دین کی مصیبت کے وقت ہمارے لئے یہ ہرگز جائز نہ تھا۔ وہ غذا بھی ایک مجاہدہ معلوم ہوتا تھا، یہ ایک لڑائی ہوتی تھی ان لطیف اور نفیس جذبات کے درمیان جو اسلام

اور دین کی تائید کیلئے اُٹھ رہے ہوتے اور ان مطالبات کے درمیان جو خدا تعالیٰ کی طرف سے قانونِ قدرت کے پورا کرنے کیلئے قائم کئے گئے تھے مگر ہم جو رسول کریم ﷺ کی امت اور صحابہ کا نمونہ ہونے کے مدعی ہیں کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ وہی جرأت اور دلیری اپنے اندر پیدا کریں جو صحابہ کے اندر تھی۔ آج قربانی پر اُبھارنے کی بجائے اُسے روکنے والے آپ کو ملیں گے اور بہادری کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں مگر مؤمن ہنسی اور تمسخر کی کوئی پرواہ نہیں کیا کرتا وہ دنیا سے اندھا ہوتا ہے، اُس کی بینائی صرف خدا کو دیکھتی ہے، اس کے دل کی نظریں بلند اور ظاہری آنکھیں جھکی ہوئی ہوتی ہیں، اس کے نیکی کے کام کھلے ہوئے مگر بدی کے بند ہوتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کیلئے ہر قربانی کرنے کو عزت سمجھتا ہے اسے کامیابی سمجھتا ہے اور اسی کو نجات خیال کرتا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رستہ میں انسان کا قربان ہونا سب سے بڑی عزت ہے۔ گو یہ لڑائی کا زمانہ نہیں مگر قربانیوں سے خالی نہیں۔ بے شک آج ہمیں عَلَی الْاِعْلَان قتل نہیں کیا جاتا مگر احمدیت کیلئے آج بھی ہزاروں قسم کی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ ہمارا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں، مارا پیٹا جاتا ہے اور جب تک جماعت میں سے ایک ایسا حصہ کھڑا نہ ہو جو بہادری اور وفاداری کا وہ نمونہ دکھائے جو دشمن کو بھی کھینچ لیتا ہے اُس وقت تک کامیابی کے قریب نہیں پہنچ سکتے۔

بعض لوگ یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ہمارے دائیں ہاتھ والا کیا کرتا ہے اور بائیں ہاتھ والا کیا کرتا ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا غرض کہ دائیں ہاتھ والا کیا کرتا ہے اور بائیں ہاتھ والا وفادار ہے یا نہیں۔ کیا اگر ساری دنیا مرتد ہو جائے اور صرف ایک مؤمن رہے تو وہ اس لئے جان دینے سے دریغ کرے گا کہ اور کوئی اس کے ساتھ نہیں۔ جن مواقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی جان کو خطرات میں ڈالا کیا یہ دیکھ کر ڈالا تھا کہ آپ کے دائیں کون ہے اور بائیں کون اور کس حد تک آپ کی مدد کریں گے؟ کیا جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعویٰ کیا تو یہ دیکھا تھا کہ میرے مؤید اور حامی کون کون ہیں؟

ایک دفعہ ایک مولوی صاحب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ اعتقاد رکھتے تھے یہاں آئے اور آپ سے کہنے لگے کہ آپ نے غلطی کی مولوی لوگ ضدی ہوتے ہیں جب آپ نے

دعویٰ کیا تو انہوں نے سمجھا کہ یہ شخص ہم سے بڑا ہو گیا ہے اس لئے مخالفت شروع کر دی۔ اگر آپ دعوے سے پہلے علماء کو بُلاتے، اُن کی دعوت کرتے اور پھر پوچھتے کہ اسلام پر جو اِس قدر مصیبت کے ایام ہیں آپ لوگوں نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور اس سے عیسائیوں کو اسلام کے خلاف بہت تقویت حاصل ہوتی ہے۔ آپ صاحبان اس کا کوئی حل سوچیں تو وہ ضرور کہتے کہ آپ ہی اس کا کوئی حل سوچئے۔ اس پر آپ کہہ دیتے کہ اگر ہم کہہ دیں کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے ہیں تو اس مشکل سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور وہ ضرور کہہ دیتے کہ ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ کیا نکتہ نکالا ہے۔ پھر آپ کہتے کہ ایک مشکل یہ ہے کہ جب ہم ان کی وفات کا اعلان کریں گے تو عیسائی کہیں گے کہ احادیث میں تو ان کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہونا چاہئے وہ ضرور پھر یہی کہتے کہ اس کا بھی کوئی جواب آپ ہی فرمائیں تو آپ کہہ دیتے کہ اس کا علاج یہی ہے کہ ہم کہہ دیں آنے والا اِسی اُمت میں سے ہوگا۔ اس پر پھر وہ یہی کہتے کہ سُبْحَانَ اللّٰہ کیا اچھی بات نکالی ہے۔ پھر آپ کہتے کہ اب صرف ان کا ایک اعتراض رہ جاتا ہے کہ جب سب علامتیں پوری ہو چکی ہیں تو آنے والا کہاں ہے؟ آپ لوگ رسول کریم ﷺ کی گدی پر بیٹھے ہیں اپنے میں سے کسی کے متعلق فیصلہ کر دیں کہ وہ مثیلِ مسیح ہے تا عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب بھی ہو جائے اور اسلام کو ترقی نصیب ہو۔ مولوی تو چونکہ سخت حاسد ہوتے ہیں وہ کیا مجال جو اپنے میں سے کسی کو مان لیتے ضرور یہی کہتے کہ آپ سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ یہ سن کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر انسانی منصوبہ ہوتا تو میں ضرور ایسا ہی کرتا مگر مجھے تو میرے خدا نے جو کہا میں نے لوگوں کو سنا دیا۔ یہی حال انبیاء کی امتوں کا ہوتا ہے وہ جب صداقت کو لے کر کھڑی ہوتی ہیں تو یہ نہیں دیکھا کرتیں کہ ہمارے دائیں کون ہے اور بائیں کون ہے وہ صداقت کو لے کر دنیا میں آتی ہیں اور لوگ خواہ اُن کو ماریں، پیٹیں، قتل کر دیں بلکہ قیمہ کر دیں، جلا دیں، ڈبو دیں پیچھے نہیں ہٹتیں۔ پس یہ جذبہ اگر ہمارے نوجوانوں میں اور جماعت میں پیدا ہو تو پھر وہ لوگ ہم میں سے پیدا ہوں گے جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اگر چالیس مؤمن مجھے مل جائیں تو مَیں دنیا کو فتح کر سکتا ہوں ۔ ۔

خوب یاد رکھو بُزدل لاکھوں بھی دنیا کو نفع نہیں دے سکتے، بے وفا کروڑوں کسی کام کے نہیں مگر متوکل اور وفادار چالیس بھی ہوں تو دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ تم سوچو کہ آخر تمہارے اس مقام کو حاصل کرنے میں کیا روک ہے؟ کیا صرف یہی نہیں کہ تم سمجھتے ہو ہم یہ مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ مگر یاد رکھو کہ تم خدا کے سوتیلے بیٹے نہیں ہو۔ ابوبکرؓ کو خدا پر اس سے زیادہ حق نہیں تھا جو تمہیں ہے، عمرؓ کو اس سے زیادہ خدا تعالیٰ پر حق نہیں تھا جو تمہیں ہے، عثمانؓ اور علیؓ کو اللہ تعالیٰ پر اس سے زیادہ حق نہیں تھا جو تمہیں ہے۔ اگر تم آج یہ ارادہ کر لو کہ ہم بھی توکل کے مقام پر کھڑے ہو کر اپنے ربّ سے ایسا رشتہ پیدا کریں گے کہ اس کے مقابلہ میں کسی چیز کی پرواہ نہ رکھیں گے تو وہی جو ابوبکرؓ کو ملا تمہیں مل سکتا ہے، جو عمرؓ کو ملا تمہیں مل سکتا ہے، جو عثمانؓ اور علیؓ کو ملا تم حاصل کر سکتے ہو صرف عزم اور ارادہ کی دیر ہے۔ صرف کُودنا اور چھلانگ لگانی ہے اور پھر دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ پس تم میں سے جو ہمت والے ہوں وہ یہ عزم کر لیں۔ خدا کے قُرب کی خواہش تم میں سے جو رکھتے ہیں میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ خدا بہت قریب ہے اتنا قریب ہے اتنا قریب ہے کہ اگر کوئی نابینا کی طرح آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا دے تو اسے چھو سکتا ہے اور اسے چھو کر ایسا نور حاصل کر سکتا ہے جس کے بعد تمام اندھیرے دور ہو جاتے ہیں اور ایسی طاقت حاصل کر سکتا ہے جس کے حاصل ہونے پر شیطان کی تمام طاقتیں مٹ جاتی ہیں۔

(الفضل ۷؍مئی ۱۹۳۶ء)

۱؎ پروہت: خاندانی برہمن جو تمام خاندان کی پوجا پاٹ، موت اور بیاہ کی رسوم ادا کرتا ہے۔

۲؎ سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۸۵۔ مطبوعہ مصر ۱۹۳۴ء

۳؎ سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۸۵ مطبوعہ مصر ۱۹۳۴ء

۴؎ اسد الغابۃ جلد ۴ صفحہ ۱۴۸، مطبوعہ ریاض ۱۲۸۶ھ

۵؎

۶؎

۷؎ ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۳۴۲۔ جدید ایڈیشن